بنتی ہے جس میں طریقِ اعجام (نقطے لگانا) کا فرق بھی شامل ہے۔ اس لیے اب ہم ملکوں اور علاقوں کا (بار بار) ذکر کرنے کی بجائے زیرِ مطالعہ قطعۂ آیات (پیراگراف) کے کلمات میں ضبط کے اختلاف کے مواقع اور صورتِ اختلافِ ضبط کا ذکر کر دیا کریں گے۔

مثلاً آیت زیرِ مطالعہ میں اختلافِ ضبط کی حسب ذیل صورتیں موجود ہیں:

(۱) ہمزۃ الوصل کی علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا ــ اس کی مثال اسمِ جلالت " اللہ " کے ضبط میں ملے گی۔

(۲) ہمزۃ القطع کی علامت قطع ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ اس کا نمونہ " ابصارھم " کے ضبط میں آئے گا۔

(۳) " واو ساکنہ " ماقبل مضموم کی علامت سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ اس کا اثر " قلوبھم " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۴) یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامتِ سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا اور اس ماقبل پر کسرہ ظاہر کرنے کا فرق۔ اس کی مثال کلمہ " عظیم " کا ضبط ہوگا۔

(۵) الف ماقبل مفتوح پر علامتِ فتحہ یا علامتِ اشباع (ـٰ) ڈالنے کا فرق ــ اس اختلاف کا اثر کلمات " ابصارھم "، غشاوۃ اور " عذاب " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۶) الف محذوفہ (یا مقصورہ) کے ضبط کا فرق کلمات " علیٰ " اور " ابصار " اور " غشاوۃ " (بصورت حذف الالف) کے ضبط میں نمایاں ہوگا۔

(۷) اسم جلالت " اللّٰہ " کے ضبط اور علامتِ اشباع ڈالنے یا نہ ڈالنے کا فرق

(۸) تنوینِ اظہار اور تنوینِ اخفاء کی کتابت مختلف یا یکساں ہونا۔ تنوینِ اظہار کا نمونہ کلمہ " عذاب " میں اور تنوینِ اخفاء کا نمونہ یہاں کلمات " غشاوۃ " اور " عظیم " کے ضبط میں سامنے آئے گا۔

(۹) تنوینِ اخفا کے بعد " یرملون " کے کسی حرف کے ادغام کی علامت (بصورت تشدید) ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ یہ فرق " غشاوۃ " کے بعد " ولھم " میں ظاہر ہوگا۔

(۱۰) قلقلہ کے لیے مخصوص علامت سکون کلمہ " ابصارھم " کی " ب " پر ظاہر ہوگی۔

© rasailojaraid.

(۱۱) "ساعد" کی ترقیق یا تفخیم کے لیے الگ الگ صورت "ر" یا "ر" استعمال کرنا ـــ یہاں ابصارِھم کی "ر" اس کی ترقیق کو ظاہر کرے گی ۔

(۱۲) اسم جلالت "اللہ" کی لام کی تفخیم کے لیے مخصوص علامتِ اشباع ۔ مندرجہ بالا ہر سہ طریق ضبط (۱۰، ۱۱، ۱۵) صرف تجویدی قرآن مطبوعہ پاکستان کی خصوصیت ہیں ۔

(۱۳) افریقی ممالک کے "ف" اور "ق" کے طریق اعجام (نقطے لگانے) کا فرق ۔ کلمہ "قلوبھم" کی کتابت میں سامنے آئے گا ۔

اس طرح آیت زیرِ مطالعہ کے کلمات میں اختلاف ضبط کی مندرجہ ذیل "مضبوط" صورتیں ملتی ہیں لیکن ان کے ضبط میں کوئی اختلاف نہیں (سوائے اس کے کہ حرکات کی شکل مختلف ہوں یعنی زبر، زیر، پیش لکھنے کا انداز مختلف ہے۔ ان کلمات کو لکھنے کی ضرورت نہیں مثلاً یہاں "سَمْعِهِمْ"، "خَتَمَ" اور "لَهُمْ" کا ضبط ہر جگہ اور ہر ملک میں یکساں ہے ـــ باقی کلمات میں اختلافِ ضبط کی بناء پر حسب ذیل نمونے ملتے ہیں :-

اللّٰهُ ، اللّٰهُ ، اَللّٰهُ ، اَللّٰهُ ، اَللّٰهُ

عَلٰى ، عَلَىٰ ـــ قُلُوبِهِمْ ، قُلُوبِهِمُ ، قُلُوبِهِمْ

قُلُوبِهِمْ ـــ اَبْصَارِهِمْ ، أَبْصَارِهِمْ ، اَبْصَارِهِمْ ،

اَبْصَارِهِمْ ، اَبْصٰرِهِمْ (بصورت حذف الف)۔

غِشَاوَةٌ ، غِشَاوَةٌ ، غِشَاوَةٌ ، غِشٰوَةٌ (بصورت حذف الف)

وَ ، وَ ـــ عَذَابٌ ، عَذَابٌ ، عَذَابٌ ۔

عَظِيمٌ ، عَظِيمٌ ، عَظِيمٌ ، عَظِيْمٌ ـــ

© rasailojaraid.com

"قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد"

ایک بلیغ اشارہ

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

صدر شعبۂ عربی، جامعہ پنجاب

© rasailojaraid.com

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی (مارچ ۱۹۹۰ء)
بعنوان: "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" کے موقع پر پیش کیا گیا

قرآن کریم کا نزول اور ظہور اسلام اس کائنات ارضی کی مدوّن تاریخ کا سب سے زیادہ اثر انگیز و فیصلہ کن اور سب سے زیادہ دور رس نتائج کا حامل واقعہ ہے۔ قرآنی وحی ربانی کے آغاز کے لمحہ کو رب کائنات نے یوم الفرقان یعنی حق و باطل کے درمیان حدِّ فاصل کھینچ دینے والا لمحہ قرار دیا اور اس لمحہ والی رات کو لیلۃ القدر یعنی انسانیت کا مقدر جگانے والی مبارک رات قرار دیا ہے۔ اس سراپا برکتِ سرمدی و عظمتِ جاوید والے لمحہ کی رات کو راتوں، دنوں یا ہفتوں سے نہیں بلکہ مہینوں سے بھی افضل و برتر قرار فرمایا گیا کیونکہ وقت کی جوئے رواں کے لامحدود لمحات اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں، ان کا گزرنا نہ گزرنا برابر ہے۔ ان لمحاتِ ہر دم دواں و پیہم رواں کی زندگی اور وجود فقط ان نقوش سے ہی عبارت ہے جو ان کا حوالہ بن کر تاریخ کے حافظہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔ یہ نقوش دراصل وہ اعمال اور کارنامے ہیں جو اس کائنات ارضی پر انسانیت کے حوالے سے انجام پذیر ہوئے۔ اعمال اور کارناموں کے یہ نقوش جس قدر

© rasailojaraid.com

مضبوط' دوررس اور دائمی ہوئے اسی قدر ان سے انسانیت متاثر ہوئی اور جس قدر ان سے انسانیت متاثر ہوئی اسی قدر ان کی اہمیت وقدر وقیمت کا تعیّن ہوا' اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نزول قرآن کریم کے آغاز کا لمحہ' جو رات کے حوالے سے لیلتہ القدر کہلایا اور دن کی نسبت سے یوم الفرقان یا یوم القرآن کہلانے کا مستحق ٹھہرا' کائنات ارضی پر انسانیت کی تاریخ کا سب سے زیادہ اثرانگیز وفیصلہ کن اور سب سے زیادہ دوررس نتائج کا حامل لمحہ ہے کیونکہ اسی دن تو انسان کی تمام سعادتوں اور عظمتوں کا ضابطہ حیات سامنے آیا اور اسی لئے اس ضابطہ حیات کی تکمیل کو اللہ رب العزت کے انعامِ سرمدی کی تکمیل قرار دیا گیا- اس لمحہ پر اور اس انعام پر انسانیت جس قدر بھی ناز کرے کم ہے-

© rasailojaraid.com

اس زندہ جاوید کتابِ مقدس کا پیغامِ حکمت' ازل سے ابد تک کی قدیم اور جدید تمام حکمتوں کا جوہر اور ان کی تکمیل ہے' گویا رہنمائی کے لئے ابن آدم کو حکمتِ ربانی کی شکل میں جو کچھ درکار تھا مل گیا- یہ انسانیت کے نام خدا کا آخری پیغام ہے جو جامع و اکمل بھی ہے اور نسخۂ ہدایت ابدی بھی - اس کا نظامِ عدل چونکہ کائنات کی روحِ اعتدال و توازن کا ترجمان ہے اس لئے ہر زمان و مکان میں قابل عمل بھی ہے- اس کتاب مبین کے یہی امتیازات ہیں جو اس کی حکیمانہ تعلیمات کو ابدی ودائمی ہونے کا شرف عطا کرتے ہیں' بقول حکیم الامت ؂

آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ' حکمتِ او لایزال است و قدیم

قدیم ولایزال حکمت ربانی کی حامل اس کتاب زندہ کا درس اول چونکہ تخلیق آدم کے اعجاز خداوندی کے ساتھ ساتھ علم و قلم کی عظمت پر مشتمل ہے اس لئے اس کے لانے والے نے علم کی روشنی کو انسان کا محض حق قرار نہیں دیا کہ اس سے دست بردار ہو کر سبکدوش ہو جائے بلکہ زیور علم سے آراستہ ہونے کو ہر مرد و زن کا فریضہ منصبی قرار دیا' اس لئے امتِ قرآن کا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنا نامعقول و ناممکن سی بات ہے- اس کتاب نے درسِ توحید کے ساتھ وحدتِ نسل انسانی' مساوات' اخوتِ اسلامی اور احترام آدمیت کے علاوہ بھوک اور غلامی سے انسانیت کو نجات دلانا اولاد آدم میں سے ہر فرد کا حقیقی مشن اور مقصد اصلی قرار دیا ہے- الغرض یہ اور اسی

© rasailojaraid.com

قسم کے حقائق زندگی ہیں جو قرآن کریم سے قبل کسی کو معلوم تک بھی نہ تھے کوئی ان کا قائل تو کیا ہوتا، مگر یہی قرآنی حقائق زندگی ہیں جو آہستہ آہستہ مسلم عالمی صداقتیں قرار پا گئیں اور آج یہی عالم انسانیت کا منشور حقوق بن گیا ہے گویا شعوری اور لاشعوری طور پر انسانیت قرآنی صداقتوں پر ایمان لاتی جا رہی ہے، ظاہر ہے جس کتاب کی یہ حقیقی اہمیت ہو مگر لوگ اس کے نہ صرف منکر ہوں بلکہ اس سے آگاہ بھی نہ ہوں تو اس کتاب حق کی طرف رجوع کی دعوت ہر مسلمان کے لئے بالخصوص اور ہر انسان کے لئے بالعموم بے حد مبارک اقدام بلکہ وقت کا تقاضا ہے اور اس دعوت کا داعی تحسین و تبریک کا مستحق ہے، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مبارک و مقدس کام کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر کے وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے اس لئے ان کی اس دعوت پر لبیک کہنا امت کا بھی فرض بنتا ہے۔

"دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" ڈاکٹر صاحب کی تقاریر و تحریرات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات کی مناسبت سے سامنے آتی رہی ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنے اس مجموعہ میں شامل تحریروں میں سے چھٹے باب کو اپنی محبوب ترین تحریروں میں سے ایک تحریر شمار کیا ہے جیسا کہ دیباچۂ کتاب سے واضح ہوتا ہے۔ یہ باب در اصل مہجوریٔ قرآن اور اس کے المناک نتائج کی داستان پر مشتمل ہے لیکن یہ داستان جتنی طویل ہے اس کے مقابلے میں یہ باب اتنا ہی مختصر بلکہ مجمل ہے۔ فاضل مصنف کو خود بھی اس کا احساس ہے ان کی رائے یہ ہے کہ بعض طبعی و منطقی اسباب کے نتیجے میں قرن اول ہی سے مہجوریٔ قرآن کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب سے کسی حد تک اتفاق کرتے ہوئے اسی مختصر باب کی طویل داستان کو موضوع بنا رہا ہوں مگر میری گفتگو بھی مختصر اور تشنہ ہی رہے گی، اس لئے کہ مہجوریٔ قرآن کی یہ داستانِ الم اپنے ابعاد، اسباب اور نتائج کے اعتبار سے ضخیم مجلدات کی مقتضی ہے، یہ کام وقت کے ساتھ مجهودِ جبّار کا بھی محتاج ہے۔ شاید اللہ تعالےٰ اپنے کسی نیک بندے کو اس کی توفیق ارزانی فرمائے، بہر حال اپنی علمی بے بضاعتی اور وقت کی تنگ دامانی کے باوصف "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اختصار و اجمال کے ساتھ اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ایک دو باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

موضوع، فاضل مصنف اور میرے ذاتی تاثر سے ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقاریر اکثر و بیشتر میں نے ٹیلی ویژن کے توسط سے ہی سنی ہیں، براہ راست جلسہ گاہ یا منبر مسجد سے انہیں سننے کا بہت ہی کم موقع ملا ہے۔ ان کی تحریریں بھی پڑھیں مگر کم کم لیکن ان سے جو سنا اور ان کا جو کچھ لکھا ہوا بھی پڑھا ہے اس سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آئیں، ایک تو یہ کہ ان کی بات دل سے نکلتی ہے اس لئے اثر بھی رکھتی ہے، دوسری بات یہ نظر آئی ہے کہ ان کا دماغ بھی ان کے دل کا ساتھ دیتا ہے۔ جو بات وہ قاری یا سامع تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ نوک زبان سے ہو یا زبان قلم سے وہ ہوتی بالکل واضح ہے، فصاحت و بلاغت کی دنیا میں اسے اظہار مافی الضمیر پر کامل قدرت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے تحریری و تقریری اسلوب بیان میں ادب و شعر کی چاشنی بھی ہوتی ہے جو بات کو پُر اثر اور دلچسپ بنانے میں بڑا کام کرتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فہم و تفہیم قرآن کے سلسلے میں اپنے جو ابعادِ اربعہ ذکر کئے ہیں اور جن کی خوشہ چینی کا انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے ان میں دو ابعاد کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ پیرِ رومی اور لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے نقوش بھی ڈاکٹر صاحب کی تحریر و تقریر میں جابجا نظر آتے ہیں گو اس مقدار میں نہ سہی جو ابعاد اربعہ کے اثرات کے ضمن میں مسلم و معترف بہ سمجھی گئی ہے۔

ایک اچھے خطیب و ادیب کے لئے اپنے موضوع پر کامل گرفت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موقع کی مناسبت سے مطلوبہ شرائط کے اندر رہتے ہوئے اپنی بات کو قاری و سامع تک پہنچا دینے کی قدرت فصحاء و بلغاء کے کمالات میں سر فہرست ہے۔ بعض لوگوں کو بات شروع کرنا نہیں آتا اگر آغاز پر قادر بھی ہو جائیں تو بات بڑھانے سے قاصر رہتے ہیں مگر بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ آغاز بھی ہو گیا سلسلہ گفتگو بھی بڑھنا شروع ہو گیا مگر بات کو سمیٹنے اور نقطۂ اختتام پر پہنچنے میں عجز محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب بات شروع کرنا، اسے آگے بڑھانا مگر مقدار سے آگے نہ بڑھنا اور حرف آخر پر پہنچ کر دل نشین انداز میں بات ختم کرنا بھی جانتے ہیں۔ یہ کام موضوع پر کامل دسترس، نفس مضمون پر پوری گرفت اور سب سے بڑھ کر وضوحِ ذہنی یا منطقی اندازِ ترتیب میں بات کو کھول کر رکھنے پر قدرت کا بھی محتاج ہے۔

© rasailojaraid.com

عرب کا خود بین و خود پسند اور منہ زور شاعر احمد بن الحسین المتنبیؔ یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ جب وہ شعر کہتا ہے تو زمانہ اس کا کلام گنگنانے لگتا ہے (اذا قلتُ شعراً اصبح الدھر منشدا) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اگرچہ ایسا کوئی واضح دعویٰ سامنے تو نہیں آیا البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ابلاغ قرآنی کی جو طرحِ نو انہوں نے ڈالی ہے اس کا ردِّ عمل ہمیں متنبیؔ کی یاد دلاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقلید میں بہت سے لوگوں نے ابلاغِ قرآنی کو اپنا شعار کیا اور "طرحِ اسراری" کے راستے پر گامزن ہوئے مگر یا تو تھک کر ہار گئے یا شہرت کی بدہضمی کا شکار ہو کر بھٹک گئے مگر ڈاکٹر صاحب نہ تھکے نہ بھٹکے البتہ قبل از وقت فریضۂ منصبی سے سبکدوشی کے اشارے ضرور مل رہے ہیں حالانکہ

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!"

یہ تو تھیں چند باتیں جو موضوع سے مناسبت رکھنے کے باوجود بھی بے تعلق سی ہیں مگر ضروری فائدے سے خالی نہ ہوں گی۔ اب کچھ بات ہو جائے چھٹے باب کی۔ فاضل مصنف نے اپنی اس ایک محبوب ترین تحریر میں "بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را" سے کام لیتے ہوئے دریا نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دریا ہو یا سمندر محاورے کے لحاظ سے تو کوزے میں شاید آ جاتے اور بند ہو جاتے ہیں اسی طرح شاعرانہ شوخی سے سارے جہان کی تمنا بھی ایک حرف میں سمٹ سکتی ہے مگر دریا دریا ہے اور سمندر سمندر رہے دونوں میں سے کسی کو کوزے میں سمونا ممکن نہیں البتہ اجمالی اشارات ممکن ہیں، ڈاکٹر صاحب نے بھی اجمالی اشارات سے کام لیتے ہوئے موضوع کے وجود اور اس کی اہمیت کا احساس دلا دیا ہے۔ اب یہ کسی باہمت و صاحب توفیق انسان کا مقدر ہو گا جو اس کے منظر و پس منظر کی تفاصیل و جزئیات کو سامنے لائے، تاہم یہ "اسراری اشارہ" اپنے اجمال اور اختصار کے باوجود ہے بہت بلیغ! بھلا قرآن کریم، جہاد فی سبیل اللہ، مہجوریٔ قرآن و اس کے نتائج اور پھر رجوع الی القرآن کی دعوت سے بڑھ کر زیادہ بلیغ اشارہ اور کیا ہو گا؟ دین و دنیا کی فلاح اور خسارہ کا حساب کتاب تو اسی بلیغ اشارہ میں موجود ہے! غالباً اسی بلیغ اشارہ کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب اپنی اس مختصر تحریر کو اپنی محبوب ترین تحریروں میں شمار کرتے ہیں اگر یہی بات ہے تو پھر یہ تحریر بلاشبہ محبوب ترین تحریروں میں شمار ہونے کا پورا پورا بلکہ حقیقی

© rasailojaraid

استحقاق رکھتی ہے' موضوع کی اہمیت و عظمت' علوِ شان اور انسانی فائدہ و منفعت کے لحاظ سے اس تحریر کا اپنا ہی مقام ہے!

اگر میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس بلیغ اشارہ کو صحیح سمجھ سکا ہوں تو اسے اجمال و اختصار کے ساتھ یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک تحریک اسلامی کا نظریاتی ضابطہ قرآن حکیم تھا اور اس نظریاتی ضابطہ کا عملی و تطبیقی یا اطلاقی نمونہ نبوی طریق کار تھا جسے جہاد فی سبیل اللہ کی ترکیب میں بیان کیا جاسکتا ہے' مگر امت کے لوگوں سے جہاں یہ نظریاتی ضابطہ اوجھل ہو گیا وہاں وہ اس نبوی طریق کار کو بھی فراموش کر بیٹھے' اب بھی نہ صرف امت مسلمہ بلکہ نوع انسانی کی فلاح دارین اسی ضابطہ زندگی کو اپنانے اور اسی نبوی طریق کار کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو تحریک اسلامی اٹھی تھی وہ اپنے اسباب و اثرات کے علاوہ اپنی اٹھان اور کامیابی میں بھی بے مثال تھی' بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح اور مناسب ہو گا کہ اس کرۂ ارضی پر انسانیت کی معلوم تاریخ میں پہلے کبھی کوئی تحریک ہی نہ اٹھی تھی چہ جائیکہ ہم اس تحریک کی مثالیں تلاش کرتے پھریں' بلکہ بعد کے زمانوں میں اس تحریک کی نظیر بھی نہ لائی جاسکی بقول متنبیؔ:

مَضَتِ الدُّھُوْرُ فَمَا اَتَینَ بِمِثْلِہٖ   وَلَقَدْ اَتٰی فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِہٖ

ترجمہ: زمانے بیت گئے مگر ان بیتے زمانوں میں اس کی مثال نہ تھی اب وہ آچکا تو زمانے اس کی نظیر لانے سے بھی عاجز ہیں!

غار حراء سے پھوٹنے والی روشنی کی کرن سے پہلے کسی نبی' کسی رسول' کسی مصلح' کسی بانیٔ مذہب یا کسی قائدِ قوم نے ایسی تحریک نہ شروع کی' آپؐ سے پہلے کا ہر نبی اور رسول اپنی اپنی قوم کو ایک ہی بات سمجھاتے سمجھاتے گزر گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو۔ ہر بانی مذہب اور ہر مصلح دینی کا دائرہ عمل مذہبی رسوم کی تلقین و اصلاح تک محدود رہا' یا اگر کوئی قائد قوم و سپہ سالار روم و یونان اور ہند و ایران سے اٹھا تو تباہی اور بربادی کے طوفان کی طرح اٹھا اور اپنے پیچھے ویرانی اور کھنڈرات چھوڑ گیا۔ مگر غارِ حراء سے پھوٹنے والی سرمدی روشنی کی کرن ایک ہمہ جہت تغیر و تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب تھا' یا ایک ٹوٹل چینج (Total Change) تھی' مگر اس ہمہ جہت تغیر و

© rasailojaraid.com

تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب کا امتیاز اعتدال و توازن تھا، اس کی نرم روی شفقت مادری سے زیادہ خوشگوار تھی اور اس کی سخت گیری ایک ہمدرد ماہر سرجن کے آپریشن سے زیادہ نفع بخش و صحت مند تھی، تحریک اسلامی کے بعد کرۂ ارضی پر اٹھنے والی ہر انسانی تحریک بلاشبہ اس تحریک اسلامی کی خوشہ چین تھی مگر کبھی اِس انتہا پر کبھی اُس انتہا پر ہونے کی وجہ سے لولی لنگڑی ثابت ہوئی اور بالآخر اپنے بانیوں اور کارکنوں کا ماتم کرتی ہوئی تاریخ کے تاریک گوشوں میں گم ہو گئی۔ اس کی آخری اور تازہ ترین مثال کمیونزم ہے جو ناکامی کے بعد حسرت و ندامت کے آنسو بہاتے، ہاتھ ملتے اور اپنے بانی کا ماتم کرتے ہوئے تاریخ کے تاریک گوشوں میں کھو جانے کے لئے پابہ رکاب ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے کہ تحریک اسلامی کے دو ستون تھے ایک نظریاتی اصولِ حیات کا ستون جسے قرآن کریم کہتے ہیں اور دوسرا عملی یا تطبیقی ستون جسے جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا، تحریک اسلامی کی قوت میں یہ ثنویت اعتدال و توازن کی ضامن تھی، نظریہ کے ساتھ عمل نہ ہو تو نظریہ بیکار ہے بلکہ بے ثمر درخت ہے۔ اسی طرح اگر عمل کسی صحت مند نظریاتی اصول پر مبنی نہ ہو تو وہ بھی بے جان اور بے فائدہ ہے بلکہ جڑوں سے محروم درخت ہے ایسے درخت سے کسی پھل کی امید احمقانہ توقع کے سوا کچھ نہیں، عقیدہ و ایمان کے ساتھ عمل یا نظریہ کی عملی تطبیق دراصل اعتدال و توازن کے اس نظام کی ترجمانی و تعبیر ہے جس اعتدال و توازن پر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اس اعتدال و توازن میں خلل قیامِ قیامت کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح قوم کی زندگی میں اعتدال و توازن سے بقائے حیات و ترقی وابستہ ہے یا فرد کے جسم و جان کے نظام میں اعتدال و توازن کا مطلب تسلسل حیات ہے چنانچہ جب قوم میں اعتدال و توازن مفقود ہوتا ہے تو زوال و انحطاط کی سیڑھیوں سے لڑھکتے پھسلتے ادبار و انعدام کے مراحل آتے ہیں اور جسم انسانی جب اعتدال و توازن سے محروم ہوتا ہے تو امراض و اسقام کے بعد موت کی آغوش میں جانا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مختصر سے باب میں جن مسائل کو چھیڑا ہے ان میں سر فہرست قرآن کریم ہے جو تحریک اسلامی کا پہلا بنیادی ستون ہے جو نظریاتی ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے متعلق گزشتہ سطور میں اجمالی باتیں آ گئی ہیں جن کا

© rasailojaraid.com

تکرار باعث ملال ہو گا‘ مگر قرآن کریم سے دوری کے اسباب کا کھوج لگانے کے لئے عملی طریقۂ کار کی ایک مثال پیش کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہو گا اور اس سے یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ امت نے دانستہ نہیں بلکہ لاشعوری طور پر یا دشمنوں کی سازش و ملمع سازی سے جو لغزشیں کھائی ہیں ان میں قرآن سے دوری سر فہرست ہے‘ جیسا کہ اشارہ گزر چکا ہے کہ تحریک اسلامی کے بنیادی نظریاتی ستون کا نقطۂ آغاز تخلیق انسان کی کرشمہ سازی و اعجاز ربانی کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ علم و قلم کی عظمت کا اعلان بھی تھا۔ قرآن کریم میں علم کی اہمیت نے امت مسلمہ کو شمع علم کا پروانہ بنا دیا اور شیخ شیراز جب علم کی راہ میں شمع کی طرح پگھلنے کی نصیحت کر رہے ہوتے ہیں تو اس میں یہی قرآنی نقطۂ نظر سامنے ہوتا ہے‘ اسی کتاب زندہ و منبع حکمت کے طفیل بقول سیوطی اسلام میں [illegible] علوم وجود میں آئے۔ ملت اسلامیہ میں علوم کی ایجاد کا سلسلہ اور تعلّم و تعلیم کا مشغلہ کارِ فضیلت ٹھہرا مگر امت ایجاد و توسیع علوم کے میدان میں جس قدر آگے بڑھتی گئی اسی قدر ان علوم کے محرک اول و سرچشمۂ حقیقی قرآن مجید سے دور سے دور تر ہوتی گئی حتّٰی کہ کسی کو یہ احساس تک بھی نہ رہا کہ ان علوم کا اصل و حقیقی سر چشمہ کبھی قرآن کریم ہی تھا۔

جس طرح مسلمانوں کا سرمایۂ علم جب یورپ کے ہاتھ لگا اور اس نے اس سرمایہ کی بنیاد پر اپنی دکان علم سجائی تو اسے اتنا اونچالے گیا کہ آج انہیں بھی یہ باور کرانے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ ان کے دنگ کر دینے والے علوم کی دکان میں جو چمک دمک ہے وہ مسلمانوں کے علوم کی مرہون منت ہے اسی طرح مسلمانوں کے یہ علوم قرآن مجید کے مرہون منت ہیں‘ یہ علوم جس قدر قرآن سے دور ہوتے گئے اسی قدر بشریت کے لئے نفع بخش و سود مند ہونے کے بجائے ضرر رسانی کا شیطانی وسیلہ بنتے گئے۔ اس لئے آج اگر ہم پھر اس انسانی سرمایہ علم کا رشتہ قرآن کریم سے جوڑ سکیں ”تو علم را بر تن زنی مارے بود“ کے بجائے ”علم را بر جاں زنی یارے بود“ کی صورت بنتی جائے گی۔ اس لئے دعوت رجوع الی القرآن کے ضمن میں مسلم سائنسدانوں کا نقطہ نظر بدلنا ہو گا۔ ہر سائنسی میدان کے لئے درس گاہیں قائم کرنا اور علماء تیار کرنا ہوں گے تاکہ ہر علم و فن کا ماہر اپنے علم و فن کی قرآنی بنیاد سے آگاہ ہو‘ صرف اسی صورت میں علم کو

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com